تجدد پسندی اور قدامت پرستی

الطاف جاوید

ھمارے ھاں عام طور پر اور بالخصوص اکثر مذھبی طبقوں میں جمود ' متشدد قسم کی قدامت پرستی اور یکسانیت کو نیکی اور تقوی سے تعبیر کیا جاتا ھے۔ اور تجدد پسندی کے بارے میں یہ عام خیال ھے کہ انسان اسے اس وقت اختیار کرتا ھے' جب اس کو اپنی ناجائز خواھشات کی تسکین منظور ھوتی ھے۔ مجموعی لحاظ سے ھمارے مذھبی فکر کی یہ ایک بنیادی کمزوری ھے کہ وہ تجدد اور ارتقا سے خوف زدہ رھتا ھے' معلوم نہیں یہ کیسے سمجھ لیا گیا ھے کہ کائنات اور حیات اپنے اعمال میں تجدد' تغیر اور ارتقاء سے عاری ھے۔ حالانکہ مسلمان ھونے کی حیثیت سے ھمارا اس بات پر راسخ عقیدہ ھونا چاھئے کہ ذات باری تعالیٰ کی صفات جس طرح زمان متسلسل (Serial Time) کی ابتدا میں کام کر رھی تھیں' آج بھی اسی طرح مصروف عمل ھیں۔ اور آن میں نہ کبھی تعطل پیدا ھوا اور نہ آئندہ ھوگا ۔ کیونکہ تعطل کا اقرار تخلیق کا انکار ھے۔ اور تخلیق اپنے معنی کی کلیت میں اس وقت تک پوری نہیں اترتی جب تک اس میں تجدد اور ارتقا نہ ھو۔ یعنی تخلیق محض میکانکی عمل نہیں' بلکہ وہ نام ھے ترقی پذیر عمل کا، اور جہاں تک اللہ کی ربوبیت کا تعلق ھے۔ وہ تخلیق ھی کے ذریعہ تکمیل پذیر ھوتی ھے' بلکہ خدا تعالیٰ کے اسمائے حسنہ میں سے اس کے اسم '' رب '' کا عملی اقتضا ھی یہی ھے کہ اس کی تخلیق ھمہ دم جاری و ساری ھے۔ کسی شے کا مختلف اطوار و مراحل میں سے گزر کر اپنی تکمیل اور تخلیقی غایت تک پہنچنا تخلیقی عمل کو نہ صرف ھمہ دم جاری و ساری قرار دیتا ھے' بلکہ اس تخلیقی عمل میں '' مسلسل ارتقا '' کی کیفیت کے پائے جانے کی طرف اشارہ کرتا ھے۔

اس کائنات میں حرکت کے دو اقسام ھیں۔ میکانیکی اور تخلیقی ۔ میکانیکی حرکت ایک ھی دائرہ میں بار بار چکر کاٹتی رھتی ھے ۔ یہ حرکت کسی

نئی قدر کی تخلیق نہیں کرتی۔ اگر حیات و کائنات میں پائی جانے والی حرکت محض میکانکی حرکت ہے، تو اس خدا کے ''حکیم'' ہونے پر حرف آتا ہے۔ کیونکہ حکمت نئی اقدار کی ضرورت کو محسوس کرنے اور ان کی تخلیق کے لئے مناسب سامان و لوازمات مہیا کرنے کا نام ہے۔ لہذا تجدید و ارتقا کا انکار جہاں اللہ کی صفات میں تعطل کے تصور کی حمایت کرتا ہے وہاں خدا کے حکیم ہونے کی صفت پر بھی اثر انداز ہوتا ہے، اور یہ سراسر منافی ہے اس تصور کے، جو ذات خداوندی کے متعلق قرآن مجید میں پیش کیا گیا ہے۔ (کل یوم ہو فی شائن)۔

تجدد پسندی انسانیت کی محسن اس لئے ہے کہ یہ اللہ کی نئی شان کی نمائندہ ہوتی ہے چونکہ اللہ کی ذات سراپا افادہ و فیضان ہے۔ اس لئے اس کی شیئون مختلفہ وجود کے ارتقائی مراحل کے ہر نئے مرحلے پر نئی تجلیات اور نئے تقاضوں کے ساتھ ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ اور یہ افادہ و فیضان لازمی طور پر اپنی فطرت میں ارتقاء پسند ہے، یعنی اس افادہ و فیضان کا اظہار ایک ادنیٰ حالت کی نفی کرکے اعلیٰ حالت کو اور ایک اعلیٰ حالت سے اس سے اعلیٰ تر حالت کو حاصل کرنے کی شکل میں ہوتا ہے۔ اس افادہ و فیضان کی ارتقا پذیری اور تجدد پسندی کے تقاضے صرف انواع میں ہی تغیر و ارتقاء کا باعث نہیں بنتے بلکہ یہ ایک ادنی جنس کے بطن سے اعلی تر جنس کو بھی ظہور میں لاتے ہیں۔ اب اگر زندگی کو سطحی نظر سے دیکھنے والوں کو شئون الہیہ کی یہ جدت آفرینی نظر نہیں آتی۔ تو اس کا کیا علاج۔

تجدد پسندی کے مخالف ہمارے ان مذہبی حلقوں میں ''اسلاف کرام'' کو کچھ اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ گویا ان کی سیرت و کردار میں انقلابی عمل اور وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے ہوئے تقاضوں اور معاشرتی اقدار کے ساتھ خود بدلنے کی صلاحیت کا فقدان پایا جاتا ہے۔ وہ مرنجاں مرنج سیاسی اور معاشی جھگڑوں سے بے نیاز اور چند بندھی ٹکی روایات پر خاموش عمل کرنے والے تقلید پسند افراد معلوم ہوتے ہیں، جن میں جدت پسندی اور نئی اقدار کی تخلیق کے لئے کوئی امنگ نہ پائی جاتی ہو۔ اسلاف کرام کی یہ تصویر نہ صرف واقعات کے خلاف ہے، بلکہ اس سے ان کی قدر و منزلت پر بھی حرف آتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے اسلاف کرام اپنے عہد کی یہودی، نصرانی، باز نطینی اور ایرانی تہذیبوں اور تمدنی نظاموں کی نمائندہ اور نامور شخصیتوں سے کہیں زیادہ ترقی پسند تجدید و تغیر اور ارتقاء کے حامی تھے - وہ جس دین کے داعی اور اس کی اشاعت میں کمر بستہ تھے ' اور جس فکری و نظری اور فقہی و معاشرتی و سیاسی نظام میں وہ بروئے کار تھا - یہ نظام تمام گذشتہ شرائع' منہاجات اور مناسک سے زیادہ معدلت گسترانہ ' زیادہ انسانیت پرور، زیادہ متوازن، زیادہ ہمہ گیر اور اس لئے زیادہ ترقی پسندانہ تھا - اور یہ عملی معنی تھے قران مجید کی اس آیت کریمہ کے '' ان الدین عنداللہ الاسلام ''

ہمارے اسلاف کرام نے اس دین کی روشنی میں چار دانگ عالم سے علم کے ذخیروں کو جمع کیا - ان کے تراجم کئے - ان پر تنقید کی اور نہ صرف علوم و فنون بلکہ زندگی کے دوسرے شعبوں کے امور کا بھی پورا احاطہ کیا - اور ان کے اخذ و استنباط اور انہیں نئی زندگی دینے میں جدت پسندی' فنی ذوق اور حسن آفرینی کا ثبوت دیا - ان بزرگوں کی نظر میں دین چند رسومات اور جامد روایات کے مجموعہ کا نام نہ تھا؛ بلکہ انہوں نے دین اور شرع و منہاج حکمت اور فقہ و قانون، اور معنی و صورت کے باہمی فرق کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی نظر و فکر کو ہر قسم کی تشکیل پسندی (Formalism) قانون پرستی (Legalism) اور مذہبی گروہ بندی (Sectarianism) سے بالا رکھا - اور ان کا یہ ذہنی رجحان اور نقطہ نگاہ قران مجید کی ان آیات کا پیدا کردہ تھا' جن میں یہودیوں کی الٰہی خصلتوں پر بڑی سخت تنقید کی گئی ہے -

قرآن حکیم میں دنیا کے تمام مذاہب میں سے سب سے زیادہ شدید تنقید یہودیت پر کی گئی ہے - کیونکہ یہودیت اس وقت عبارت تھی ان مذکورہ بالا تینوں منفی اقدار کے مجموعہ سے - اور یہ منفی اقدار وحدت ادیان' وحدت انسانیت اور وحدت حیات جیسی مثبت اقدار کے منافی تھیں - اور قرآن مجید انہی مثبت اقدار کا سب سے بڑا مبلغ تھا' غرض اسلاف کرام کے بارے میں یہ تصور رکھنا کہ وہ مرنجاں مرنج اور جامد روایات کے آنکھ بند کر کے تقلید کرنے والے قسم کے بزرگ افراد تھے - قطعاً صحیح نہیں -

بے شک فتنہ تاتار اور اس کے ہاتھوں پوری اسلامی دنیا کی تباہی و بربادی کے بعد ہمارے ہاں جو علماء و فضلا ہوئے۔ اُن کی غالب اکثریت پر اس بات کا اطلاق واقعی کچھ معنی رکھتا ہے۔ کیونکہ بغداد کی تباہی کے بعد اسلامی ذہن میں عام طور پر جدت پسندی نئی اقدار کی تخلیق اور نئے راستوں کی تلاش کا جذبہ سرد پڑ گیا تھا۔ اور اس کی جگہ تقلید جامد اور پہلے کی سوچی ہوئی باتوں کی محض تشریح و توضیح نے لے لی تھی۔ اگرچہ اس طویل دور میں بھی ایسے علماء و مفکرین ہر بدلتے ہوئے نئے دور میں سامنے آتے رہے ہیں، جنہوں نے زندگی کے ہر جدید دور کے مطابق اسلامی روح کی تعبیر و تفسیر کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ اور انہیں تجدید پسند بزرگوں کے کارناموں کی وجہ سے اُمت مسلمہ کے تن مردہ میں بار بار جان پڑتی رہی۔ اور اس کا نتیجہ ہے کہ آج بڑی وسیع سطح پر مسلمانوں میں نشاۃ ثانیہ کے آثار نمودار ہو رہے ہیں۔ یقیناً یہ بزرگ کتاب و سنت ہی کی طرف دعوت دیتے رہے، مگر کتاب و سنت کی تعبیر و توضیح وہ اپنے عہد کی منطق اور تقاضوں کے ماتحت کرتے تھے، اب یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے عہد کی حیات تازہ کو اسلامی قالب میں ڈھالنے کے لئے صرف ایسے ائمہ کے افکار و نظریات کو اُن علماء کے افکار سے الگ کرکے شمع ہدایت بنائیں، جو اول الذکر ائمہ کے برخلاف فکر جامد اور اسلاف کی اندھی تقلید پر زور دیتے رہے ہیں۔

بات دراصل یہ ہے کہ زندگی اپنی فطرت میں ہمہ دم تغیر پذیر، ترقی پسند اور انقلاب انگیز ہے۔ زندگی اپنی غایتی اُمنگ کے دباؤ کی وجہ سے وجود کے ایک دائرہ سے دوسرے وسیع تر دائرہ میں قدم رکھتی ہے۔ یعنی زندگی کی حرکت میکانکی نہیں بلکہ ترقی پسندانہ ارتقائی ہے۔ زندگی کا یہ عالم گیر قانون اور اس کے ارتقائی مدارج اس کی غایت اولی سے متعین ہوتے ہیں، جس کی آخری منزل میں زندگی کو اپنے خارجی ماحول کے میکانکی قوانین سے کلی طور پر آزاد اور مادی احتیاجات سے مکمل بے نیاز ہوکر ذہنی و فکری تنگ دائروں کے باہر نکل کر آفاقی اور ہمہ گیر بننا اور معاشرتی اور اخلاقی تحزیب پسندی سے نجات حاصل کرکے خیر کل کو بروئے کار لانا ہے۔

مذہبی طبقوں کی طرف سے دین اسلام کے نام سے تبدیلی، ارتقاء اور انقلاب

کے خلاف یہ وعظ ہمیشہ ہی خطرناک رہا ہے' مگر نئے ترقی پذیر معاشروں کے حق میں جنہوں نے کہ حال ہی میں غیر ملکی استعمار کی سیاسی و معاشی گرفت سے آزادی حاصل کی ہے' یہ سم قاتل کا حکم رکھتا ہے ۔ چونکہ پاکستان بھی انہیں معاشروں میں سے ہے- لہذا اسے اپنی خوش حالی اور ترقی و بہبودی کے لئے افلاس' جہالت اور غیر اخلاقی اقدار کے خلاف جو جدوجہد در پیش ہے' اس قسم کے وعظ اس جدوجہد کے راستے میں شدید رکاوٹ ہی نہیں ' بلکہ اس کے رخ کو مستقبل کی روشنی راہوں سے ہٹا کر انتشار کی اندھیاریوں کی طرف موڑ دیں گے ۔

جہاں تک اس نقطہ نظر کا تعلق ہے، جو بالعموم ہمارے یہ مذہبی طبقے پیش کرتے ہیں' تو یاد رہے کہ یہ آج کے صنعتی معاشرہ سے ما قبل جاگیرداری دور کا مذہبی تصور ہے ۔ اس تصور کو اولیں عرب معاشرہ اور اس کے بعد دنیا کے دیگر معاشروں میں انقلاب لانے والے اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے- تبدیلی اور انقلاب کی دعوت دینے والا اسلام خدا' کائنات اور انسان کو ایک مثلث کی شکل دیتا ہے، بلکہ ان تینوں کو ایک عضوی کل (Organic whole) میں تبدیل کردیتا ہے ۔ چونکہ کائنات اور حیات کا بنیادی قانون حرکت، ارتقاء اور تغیر ہے ۔ اس لئے قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات پر اس کی ہر لحظہ بدلتی ہوئی شیئوں کے پس منظر میں غور کرنے کی تلقین کرتا ہے ۔ اس طرح اللہ جو اپنی ذات میں کامل اور غیر متغیر ہے' اپنی مخلوق کے ساتھ جو ہمہ وقت متغیر بلکہ ارتقاء پذیر ہے، ایک زندہ رشتہ (Living relation) قائم کرلیتا ہے اس طرح قران حکیم ذات خداوندی کی ماورائی (Transcendental) اور سریانی (Immenent) حیثیتوں کو ایک ہی حقیقت کے دو رخ قرار دیتا ہے ۔ خدا اپنی مخلوق سے بے نیاز ہونے کے باوجود اس کے ساتھ ایک نامیاتی رشتہ (Organic relation) رکھتا ہے ۔ خدا کی ماورائی حیثیت اس کے خالق ہونے کی وجہ سے ہے ۔ بحیثیت خالق وہ اپنے تخلیق کردہ ایک عالم کی جگہ ایسے یا اس سے بہتر بے شمار عوالم پیدا کرسکتا ہے ۔ لیکن اس کی سریانی حیثیت اپنے تخلیق کردہ عالم کے ساتھ اس کے شدید تعلق کا اظہار کرتی ہے - کیونکہ

وجود حقیقی صرف ذات باری تعالیٰ کا ہے، مخلوق کا وجود اس وجود مطلق کا مستعار اور اس کا عطا کردہ ہے۔ اس کا اپنا ذاتی اور اصلی نہیں۔

خدا اپنی ذات کے داخلی ممکنات کا اظہار ایک غایت اولیٰ کے تحت کائنات اور حیات کی شکل میں کر رہا ہے۔ اور یہ کائنات ہمہ‌دم ارتقاء پذیر ہے۔ اس لئے خدا کا تصور اس کی متغیر اور حرکت پذیر شئون سے جدا کیوں کر کیا جاسکتا ہے۔ اسلام سے ما قبل یونانی اور دوسری تہذیبوں کے فلسفیانہ افکار میں اگر یہ تصور عنقا نہیں تو بے حد مبہم ضرور ہے، اور اس کی وجہ سے وہ بہت جلد رجعت پسند قوتوں کا شکار ہوگئیں۔ کیونکہ ذاتی مفاد رکھنے والے طبقے حرکت و ارتقاء کے تصورات کے، جن سے ہر معاشرتی اصلاح کا سوتا پھوٹتا ہے، ہمیشہ مخالف ہوتے ہیں اور اگر مذہبی افکار سے انہیں تائید مل جائے، تو وہ بآسانی مسند اقتدار پر قابض ہوجاتے ہیں۔

خدا کے مطلق، تجریدی اور غیر متغیر وجود کے اضافی، مادی اور تغیر پذیر کائنات کے ساتھ تعلق کی کامیاب توجیہ اور اس تضاد کو حل کرنے کی بھرپور کوشش نے انسانی افکار کی تاریخ پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ مسلمان علماء نے اس توجیہ کو بنیاد بنا کر قانون میں قیاس اور علمی تحقیق میں استقراء کے اصولوں کو دریافت کرکے ایک نئی دنیا کی طرح ڈال دی، جس میں انسان پیشہ ور مذہبی طبقوں کی روایتی سند سے بے نیاز ہوکر دین الٰہی کے تلقین کردہ مقصد حیات اور بنیادی محکمات کے منشاء کے مطابق اپنی داخلی عقلی روشنی سے ہمہ دم پیش آنے مسائل کو خود ہی حل کرنے کے قابل ہوگیا۔

تاریخ میں عام طور پر انکار کی دو شکلیں رہی ہیں۔ شکل اول میں منکر شخص اللہ کی ہستی کا تو مقر ہوتا ہے، مگر اللہ کی نئی شان کا انکار کرتا ہے۔ وہ '' تلک الایام نداولھا بین الناس '' کے بلیغ تاریخی قانون کو تسلیم نہیں کرتا اور '' وجدنا علیھا آباء نا '' کے مسلک پر سختی سے کار بند رہتا ہے۔ اس طرح قدامت پسندی، آباء پرستی اور رجعت قہقہری جیسی منفی اقدار کی ترویج کے لئے جو معاشرتی نقطہ‌نظر سے انسانی کی ترقی و نمو کے بے حد خطرناک ہیں، وہ تجدید اور ارتقاء کے خلاف صف آرا ہوجاتا ہے۔

انکار کی دوسری شکل یہ ہے کہ وہ نئے عہد اور اس کے نئے تقاضوں کو تو تسلیم کرتا ہے ۔ مگر اس نئے عہد کو اللہ کی شان قرار نہیں دیتا ۔ بلکہ اس تبدیلی کو مادے کی حرکت سے منسوب کرتا ہے جو اپنے داخلی تضاد کی وجہ سے اپنے منطقی قوانین کے وجوب کے تحت ارتقاء کی منازل طے کر رہا ہے ۔ اس طرح وہ حیات کے افق کو محض اس کے جبلی تقاضوں کو پورا کرنے کی حد تک محدود کر کے اسے اپنی تخلیقی غایت کو سمجھنے اور اسے حاصل کرنے سے محروم کر دیتا ہے ۔

قرآن حکیم نے تاریخ و کائنات کے اس حرکی قانون کے اطلاق سے انسان کی فکری و عملی تاریخ کو دو حصوں یعنی دین اور شرع و منہاج یا حکمت اور قانون پر مشتمل قرار دیا ہے ۔ اب دین یا حکمت تو سرمدی اور ابدی ہے ، مگر شرع و منہاج اور قانون اس دین یا حکمت کے اظہار کے خارجی قالب ہے ۔ اور یہ معاشرہ کی ارتقائی حرکت کے مختلف مراحل اور ان کے تقاضوں کو پورا کرنے کی غرض سے تبدیل و متغیر ہوتا رہتا ہے ۔ اس طرح قرآن حکیم کے بیان کردہ احکامات کی بھی ایک تو روح ، منشاء اور غایت ہے اور دوسرے ان کے وہ خارجی قالب ہیں' جو تاریخ کے ایک دور میں عرب معاشرہ کے مخصوص تقاضوں کے ماتحت تشکیل پذیر ہوئے ۔ لہذا ملت اسلامیہ عمومی قانون ارتقاء کے مطابق مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے اور مختلف اقوام کے مخصوص تہذیبی تقاضوں کے زیر اثر اپنے خارجی قالب بدلتی رہے گی ۔ اسلامی تاریخ میں مختلف فقہی مکاتب کا ظہور اس بات کی واضح دلیل ہے ۔

قصہ مختصر ۔ دین اسلام کی رو سے حرکت ، ارتقاء اور تبدیلی کے عالمگیر قانون کے دائرہ اثر سے نہ تو کائنات باہر ہے اور نہ تاریخ انسانی ۔ ذات باری تعالیٰ اپنے داخلی ممکنات کو دم بدم جامہ شہود پہنا رہی ہے ۔ اور اس طرح شئون متجددہ الہیہ کا سیلان ہمہ وقت حیات و کائنات میں رواں رہتا ہے ۔ جو نہ صرف اسے کمیتی (Quantative) طور پر تبدیل کرتا رہتا ہے، بلکہ کیفیتی (Qualitative) لحاظ سے بھی متغیر کر کے نئے معانی اور نئی اقدار کی تخلیق کا مستقل سامان مہیا کرتا ہے ۔

مسلمانوں کی اصول قیاس اور اصول استقراء کی دریافت حیات و کائنات کے اسی عالمگیر قانون الہی کے معاشرتی اطلاق کا نتیجہ ہے - اور انہیں اصولوں کی وجہ سے یورپ کی نشاۃ ثانیہ وجود میں آسکی - اس لحاظ سے مغربی تہذیب کے روح رواں یہی اسلامی اصول ہیں ' جن کا بدقسمتی سے آج ہمارے اکثر مذہبی طبقے انکار کر رہے ہیں -

آج عالم اسلام میں زندگی کی جدید قوتوں کے ابھرنے کی وجہ سے تاریخی محرکات روح اسلام کو ' موجودہ ترقی یافتہ ماحول کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کے لئے ، جس نئی تعبیر کو بتدریج ہمارے سامنے لا رہی ہیں ' اس تعبیر کے خلاف ہر مسلم ملک میں مختلف حربے استعمال کئے جا رہے ہیں - ان میں سے چند ایک کی نیچے نشان دہی کی جاتی ہے -

ان میں سے ایک حربہ اقتباسیت (quotationism) کا ہے - یعنی اسلاف کی روایات سے ' جو اپنے عہد میں ترقی پسند ہوتی ہیں ، نئے افکار کے خلاف اقتباسات پیش کر کے نئے افکار پر ایک تو یہ اسلاف دشمنی کا الزام لگا کر انہیں عوام کی نظروں میں بد نام کرنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ لوگ سمجھیں کہ نئے افکار ان کے بزرگوں کے خیالات و نظریات کی مخالفت کر کے ان کے تقدس و احترام کو نقصان پہنچا رہے ہیں - دوسرے ان اقتباسات سے نئے افکار سے متاثر ہونے والوں میں سے سادہ ذہن افراد کو اسلاف کی محترم شخصیتوں اور ان کے اقوال کے احترام سے مرعوب کر کے انہیں نئے افکار قبول کرنے سے روکنا - یہ حربہ ماضی پرستی کی ایک شکل ہے - اور اس سے نئی اقدار کو اپنانے میں بے حد دشواریاں پیدا ہوتی ہیں تیسرے مقدس اور محترم کتابوں سے ان کے اقتباسات سیاق و سباق سے الگ کر کے اس طرح پیش کرنا کہ ان کے مفہوم میں مغالطے پیدا ہوں - مثلاً ایک دفعہ ایک صاحب نے آیت '' لا تبدیل لخلق اللہ ،، کو ارتقاء ، حرکت اور تخلیق نو کی مخالفت میں پیش کیا - اور اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ قرآن حکیم زندگی کی ان بنیادی اقدار کا مخالف ہے -

دوسرا حربہ مذہبی اذعانیت (Religious Dogmatism) کا ہے - یہ انسانی ذہن کو زندہ معاشرتی حقائق سے علیحدہ کر کے اسے مذہب کی بے روح جامد

روایات کا پابند بنا دیتا ہے ۔ اس کے زیر اثر ذہین اور نیک دل افراد کے اذہان ٹھوس معاشرتی حقائق سے علا حدہ ہو جاتے ہیں ' جس سے کہ معاشرتی مسائل کا کوئی حل سامنے نہیں رہتا اور رجعت پسند قوتوں کو غلبہ و استیلاء حاصل ہو جاتا ہے اس صورت حال کی تاب نہ لا کر قوم کے کچھ افراد تو عیاشی و لذت اندوزی میں پڑ جاتے ہیں کچھ اس دنیا کو ملعون و ناپاک قرار دے کر اسے ترک کرنے کی ٹھان لیتے ہیں ' اور کچھ اندھا دھند نفع اندوزی میں لگ جاتے ہیں ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قدامت پرستی ذہنوں پر قبضہ جما لیتی ہے قوم کا بڑا حصہ غلط نصب العینوں کو اپنا لیتا ہے اور تقدیر پرستی قوم کا شعار بن جاتی ہے ۔

حیات و فطرت میں ہمہ دم نئی اقدار کی تخلیق کا انکار ' تجدید کے میکانکی مکتب فکر کی حمایت جس میں حرکت محض ایک دائرہ میں چکر لگاتی رہتی ہے ' نت نئے وقوع پذیر ہونے والے مسائل حیات کو حل کرنے کے لئے مذہبی روایات کے الفاظ پر زور دینا ' فطرت میں ارتقائی عمل کا انکار جس سے ایک جنس کے بطن سے اس سے مختلف مگر وسیع تر دوسری جنس کا ظہور ہوتا ہے ' زندگی کے بنیادی اور عالمگیر قوانین کو سمجھے بغیر قرآنی آیات کو اپنے مزعومہ عقائد کے جواز میں پیش کرنے پر اصرار ' سائنسی علوم کو ظنی اور غیر یقینی علوم کی حیثیت دینا ' دین کو چند بے جان رسوم کا مجموعہ قرار دے کر ان کی اندھی تقلید کرنا ' زندگی کے معروضی پہلو اور اس کے ہمہ دم بدلتے ہوئے اطوار کی اہمیت کو کم کرنا اور زندگی کے مسائل کو حل کرنے میں عقل کے استعمال کی ممانعت — یہ اور اس طرح کے بعض دوسرے رجحان اور تصورات اس مذہبی اذعانیت کو شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنا لینے کا نتیجہ ہیں ۔

اس کے برعکس قرآن مجید نے زندگی کے خارجی پہلو کے مطالعہ پر بڑا زور دیا ہے ۔ اس کے نزدیک اسرار کائنات کو سمجھنے اور مسائل حیات کو حل کرنے لئے صرف روایتی مذہبی سند کافی نہیں ، بلکہ اس کے لئے تفکر ' تدبر ' شعور اور تعقل کو استعمال کرنے کی ضرورت ہے ۔ اور یہ چیزیں محض موضوعی نہیں ہیں ' بلکہ زندگی کے معروضی پہلو سے بھی تعلق رکھتی ہیں ۔ یعنی انسان اپنے معاشرتی میل جول کے دوران ان چیزوں کا اکتساب کرتا ہے ۔

اس میں شک نہیں کہ قرآن حکیم نے زندگی کے داخلی پہلو کی اہمیت کو کم نہیں کیا بلکہ اس پہلو کو اپنانے ، اس میں رسوخ پیدا کرنے اور اس کے تزکیہ و انجلاء کی نہایت تاکید کی ہے ۔ کیونکہ اخروی حیات کا سارا دار و مدار اسی داخلی پہلو پر منحصر ہے ۔ مگر اس کے ساتھ ہی اسلام نے یہ بات بھی واضح کر دی ہے کہ زندگی کے باطنی پہلو کا تزکیہ و انجلاء اس کے خارجی پہلو پر منحصر ہے کیونکہ فردانسانی حیوان کی طرح صلۂ رحم اور معاشرتی روابط سے بے تعلق نہیں رہ سکتا ۔ وہ کسی کا باپ ، کسی کا بیٹا ، کسی کا شوہر اور اس طرح کے دوسرے رشتوں میں جکڑا ہوتا ہے ۔ اور ان روابط کی عائد شدہ ذمہ داریوں کی وجہ سے وہ خدا ، معاشرے اور اپنے ضمیر کے سامنے مسئول ہوتا ہے ۔ جب تک وہ ان ذمہ داریوں کو پوری دیانت داری کے ساتھ پورا نہیں کرتا ، اس کی اپنی فطرت کے اعلیٰ حصے تک رسائی نہیں ہو سکتی اور اسی اعلیٰ حصے کے حصول پر اس کی اخروی نجات کا دار و مدار ہے ۔ اس کے بغیر وہ معاشرتی فلاح اور اخروی نجات ہر دو سے محروم رہے گا ۔

مختصراً آج کی دنیا میں سکونیت ، ماضی پرستی اور مسائل حیات کے حل کے لئے محض روایتی مذہبی سند کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے ۔ آج کا انسان قانون میں قیاس اور علمی مسائل میں استقراء کے اسلامی اصولوں پر عمل پیرا ہو کر اپنی داخلی عقلی روشنی اور نبوت کی بتائی ہوئیں غایات حیات کے مطابق اپنے مسائل کو حل کرنے میں وحی الٰہی اور عقل انسانی ، حکمت و قانون ، روح و مادہ اور معنی صورت کے باہمی نام نہاد تضاد کو رفع کر کے انہیں ایک وحدت میں بدلنے میں کوشاں ہے ۔ اور اس دور میں یہ کہنا کہ نہ انسان بدلتا ہے ، نہ زمانہ اور نہ کائنات ، ایک ایسا دعویٰ ہے جس کی کوئی بنیاد نہیں ۔ اس قسم کے دعاوی کی تائید میں عام طور پر قرآن حکیم اور سنت نبوی کے اقتباسات کا ان کے تاریخی پس منظر اور سیاق و سباق سے علیحدہ کر کے میکانکی اطلاق کیا جاتا ہے اور ملت اسلامیہ کے انہی کرم فرماؤں کی "سعی بلیغ" کی وجہ سے قرآن مجید اور حیات نو بنو کے نامیاتی رشتے کٹ چکے ہیں ، اور اس کا عملاً یہ نتیجہ نکلا ہے کہ قرآن مجید ہر دم تبدیل ہونے والی ارتقاء پذیر زندگی کے لئے ہدایت اور روشنی بننے کے بجائے جیسا کہ وہ فی الحقیقت ہے ۔ محض برائے ثواب تلاوت کی جانے والی مقدس کتاب کی حیثیت اختیار کر چکا ہے ۔